نسیم عباس احمر

اُردو میں سرسیّد شناسی کی روایت

The Tradition of understanding Sir Syed in Urdu

Nasim Abbas Ahmar, Lecturer, Department of Urdu, Sargoda University, Sargoda.

Abstract:

'Sir Sayed Shanasi' has become an integral part of Urdu research and criticism. More than 120 books in Urdu have been published about Sir Sayed and his thoughts. There are some prominent and significant critics of Sir Sayed who have been discussed in this article. These critics can be divided into three groups. Firstly those who made criticism in order to praise him. Secondly those who criticise him and his thoughts negatively just for the sake of his opposition whereas the third group of his critics and researchers is moderate because they analyzed his thoughts with objective point of view.
In this article, an analytical study of the thought of Sir Syed has been done.

سرسیّد احمد خان انیسویں صدی کی ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ ان کی شخصیت اور خدمات، معاصرین اور متاخرین دونوں کے لیے نزاعی رہے ہیں۔ سرسیّد جس پر ہر صاحبِ خرد نے قلم اُٹھایا ہے اور اپنی مساعی سے کام لیا ہے۔ اُن کی تصنیفات و تالیفات کے مختلف پہلو جیسے، مذہب، عقلیت پسندی، نظریۂ فطرت، انگریزی طرف داری، اصلاحِ قوم، مغرب کے اثرات، تقاضے، ادبی اور تاریخی شعور بھی ہمیشہ زیرِ بحث رہے ہیں۔ اُردو میں سرسیّد شناسی کی روایت مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے۔

۱۔ سرسیّد کی موافقت، محبت اور عقیدت کے ساتھ۔
۲۔ سرسیّد کی مخالفت برائے مخالفت۔
۳۔ معروضی انداز میں فکرِ سرسیّد کا مطالعہ۔

موافقت کے رجحان کے پیش و پس منظر میں مختلف بنیادیں کارفرما ہیں۔ جن میں ادب، مذہب، اصلاحِ قوم، تاریخ اور عقیدت شامل ہیں۔

حالی کا نام اگر سرسیّد کے اوّلین معتقدین اور مداحوں میں لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حالی کی مداحی کا عالم یہ ہے، کہ وہ فرماتے ہیں کہ ''سرسیّد کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا''۔ [1] حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں سرسیّد کے نظریات کی پرداخت کے لیے ان کی نجی زندگی سے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ حالی کا محاکمہ جامع ہے اور سرسیّد کی سوانح اور تجدیدِ اسلام اور اصلاحِ قوم کے بارے میں ان کی تعبیرات زیادہ وسعت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریر کردہ سوانح پہلی بار عقیدت کے روپ میں سامنے آئی۔ حالی کی ''حیاتِ جاوید'' میں سرسیّد کے اعمال وافعال کے بیان میں جو ہمدردانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا ایک سبب حالی کا شریفانہ مزاجِ زندگی بھی ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' میں سرسیّد کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی عملی، سیاسی، سماجی خدمات کے بیان میں بھی یہی ہمدردانہ حسنِ ظن اور خوش آئند تاویل کا انداز ملتا ہے۔

سرسیّد کی ادبی خدمات کے اعتراف میں موافقت کا رجحان، آل احمد سرور، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ابواللیث صدیقی اور سیّد احتشام حسین کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔ ابواللیث صدیقی نے سرسیّد کو جدید اُردو ادب کا بانی قرار دیا۔ حامد حسن قادری اور رام بابو سکسینہ نے اُردو کے نثری اسلوب پر سرسیّد کے اسلوب کے اثرات کو اہمیت دی ہے اور اس کی مکمل دست گاہ قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور کی تحریروں میں، سرسیّد سے والہانہ محبت، ان کی رجحان پرستی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ ایک مضمون ''تہذیب اور ادب میں سرسیّد کا کارنامہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ان (سرسیّد) کا اس (زبان) سے بڑا کارنامہ اسلوب کی دنیا میں ہے جسے انھوں نے محض پینترے یا زیورِ صناعی یا کاریگری ہونے سے بچالیا اور معنویت، وزن اور وقار عطا کر کے پُرمغز، دل کشا اور دل آسا بنایا۔'' [2]

اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے سرسیّد کے ایک مخالف مولوی علی بخش خان بہادر کے اعتراضات کو اپنے مضمون ''سرسیّد کے ایک مخالف'' میں غلط ثابت کیا اور اسی طرح کا مضمون ''سرسیّد اور اکبر'' میں مماثلت تلاش کرنے والوں کے لیے بھی ہے۔

شبلی نے مذہبی ونظریاتی اختلافات کے باوجود سرسیّد کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا بلکہ ادب میں سرسیّد کو ایک ارفع مقام پر جگہ دی ہے جو کہ ان کی موافقت کا بین اظہار ہے۔ شبلی نے سرسیّد کی ادبی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسیّد کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقاید و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا۔ تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہوسکا کہ ان مسائل کو سرسیّد نے جس طرح اُردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کرسکتا۔''[۳]

سرسیّد کے مذہبی نقطۂ نظر سے موافقت میں شوکت سبزواری، خلیق احمد نظامی جیسے نام شامل ہیں۔ شوکت سبزواری نے ''سرسیّد کے مذہبی شعور'' کی بنیاد، اسلامی فکر کی حرکت، اس کی ترقی پسندی اور مادّی پہلو پر رکھی ہے۔ سرسیّد کی مذہبی موافقت کا دوسرا رُخ خلیق احمد نظامی ہیں۔ وہ سادہ مگر استدلالی اسلوب میں سرسیّد کی مذہبی خدمات کو زیرِ قلم لائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''سرسیّد نے مذہبی معاملات میں عقلیت پسندی، کشادہ ذہنی اور بے تعصبی کو رہبر بنا کر مسائل کو حل کرنا چاہا۔ غالباً ہندوستان میں وہ پہلے شخص تھے جس نے مذاہب کے تقابلی قدر و قیمت کو پہچانا۔ ان کی انجیل کی تفسیر (تبیین الکلام) اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اور اس سے ایک نئے اندازِ فکر کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر سرسیّد کچھ عرصے اور زندہ رہتے تو یہی اندازِ فکر ہندو مذہب کے مطالعہ کی طرف اختیار کرتے۔'' [۴]

سرسیّد کو بہ طور مصلح قوم سراہنے والوں میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے نام شامل ہیں۔ رشید احمد صدیقی، سرسیّد کے کارناموں کو نیم فلسفیانہ انداز میں اُجاگر کرتے رہے ہیں اور مولوی عبدالحق نے غنائیہ شاعری کے انداز میں سرسیّد کو مصلح قوم قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فرہاد کو شیریں سے اور تل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا کہ انھیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سرسیّد نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سیّد، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سرسیّد نے اسے 'نیشن' کا ہم معنی بنادیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔'' [۵]

سرسیّد کو بہ طور مؤرخ سراہنے والوں میں خلیق انجم کا نام نقشِ اوّل کی حیثیت کا حامل ہے۔ تاریخ، محض ماضی پرستی نہیں ہے بلکہ یہ سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تغیرات کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہے۔ خلیق انجم نے بھی سرسیّد کو بہ طور مؤرخ ماضی پرست نہیں بلکہ مستقبل کے نباض کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ماضی سے ہمارا رشتہ مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی۔ اپنے روشن ماضی کو یاد کرنا، ماضی کے چراغوں سے حال کے چراغ روشن کرنا اور مستقبل کے لیے راستے تلاش کرنا ہرگز قدامت پسندی یا ماضی پرستی نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو علامہ اقبال کو کس خانے میں رکھیں گے۔ مسلمانوں کی عظمت پارینہ کے سب سے زیادہ گیت انھوں نے ہی گائے ہیں۔ اگر سرسیّد اور اقبال ماضی پرست ہوکر بے عملی، مایوسی اور احساسِ ناکامی کا شکار ہوجاتے تو یقیناً قدامت پسند اور ماضی پرست کہلاتے اور ماضی سے ان کا رشتہ منفی کہلاتا، لیکن ایسا نہیں ہے، ان دونوں نے ماضی سے روشنی لے کر مستقبل کی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔'' ۶

خیال امروہی نے سرسیّد کو مارکسزم اور سوشلزم کا داعی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہر معقول طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مارکس یا لینن کے اس قول پر جذباتی بحث نہ کرے کہ 'مذہب افیون ہے' بلکہ سرسیّد کے مقالات کا مطالعہ کرے۔'' ۷

کچھ مداحوں نے سرسیّد کی موافقت میں عقیدت کا جامِ جم تھام کر مبالغہ آمیز اسلوب بھی اختیار کیا ہے ان مداحوں میں مولانا غلام رسول مہر اور صلاح الدّین محمود شامل ہیں۔ صلاح الدین محمود نے سرسیّد کی محبت وعقیدت سے سرشار ہوکر رواں اور دل آویز اسلوب میں ''لمحے کی داستان'' میں لکھا ہے:

''سرسیّد احمد خان اب ہمارے خون کے شعور کا ایک حصّہ ہیں اللہ کا رنگ لیے صدیوں سے رواں، ہمارے اس خون نے، ان کے وقتوں میں، ان کی بھی بات سنی ہے اور چاشنی پائی ہے۔ ایک روز وہ ہمارے دل میں آئے اور خون کو کچھ اور اپنا رنگ دیا، پھر دھیرے دھیرے انھوں نے ہمارے دماغ کے چند ایسے حصّوں کو، جو کہ تاریک ہوگئے تھے، دوبارہ روشنی دی، آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے دماغ کے ان روشن ایوانوں میں گشت کرتے ہیں۔ اب یہ ہمیشہ واسطے ہمارا خون ان کا ہم راز ہے۔'' ۸

سرسیّد شناسی کی روایت میں دوسرا رجحان مخالفت کا ہے۔ اس کی بھی مختلف بنیادیں اور زاویے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ نمایاں مذہب ہے اور سرسیّد کے مذہبی نظریات کی مخالفت میں رجعت پسند طبقہ صفِ اوّل کے ناقدوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طبقے نے سرسیّد کو کافر، لادین، ملحد، نیچری اور دہریہ جیسے خطابات سے نوازا۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی،

مولوی سمیع اللہ اور مولانا عبدالحیٔ، مولوی علی بخش خان، مولوی امداد العلی اور مولانا عبدالحق حقانی جیسے مفسرین اور علماء کرام شامل ہیں۔ جن میں اکثریت نے سرسیّد کے کفر کا فتویٰ حاصل کرنے کے لیے عرب ممالک کے لیے احرام باندھا۔

مذہبی مسائل میں سرسیّد کے مضبوط مخالف، دیوبند کے مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ انھوں نے سرسیّد کے متنازعہ مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے پندرہ عقائد کا رد پیش کیا۔ جمال الدین افغانی نے سرسیّد کو نیچری یا دہریہ کے خطاب سے بھی نوازا اور مسلمانوں میں اختلافات اور تقسیم کو سرسیّد کے متعین مقاصد قرار دیا۔ اس مخالفت میں ''اودھ پنچ'' اخبار کا کردار بھی بہت نمایاں ہے۔ اس اخبار کے ذریعے سرسیّد کے مضامین کو خوب مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا۔ ان کی ہجویں بھی لکھی گئیں۔

علماء کی مخالفت کا ایک نمونہ ''تفسیرِ حقانی'' سے ملاحظہ ہو:

> ''اس عرصہ میں غدر ہوگیا اور سیّد صاحب ایسی خیرخواہی اور حکام اسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر یا رفارمر بن گئے اور سی۔ایس۔آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجیب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش ۱۸۵۷ء کے فساد سے (کہ جس کا منشاء صرف توہمات جاہلانہ تھے) پر حذر ہو اور سیّد صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالاتِ مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑا اُٹھایا ہو یا اپنی ترقی اور خیرخواہی کے لیے یہ خیال از خود سیّد صاحب نے پیدا کیا ہو۔'' ۹

مولوی علی بخش خان اور مولوی امداد العلی کے نام سرسیّد کی مخالفت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالی نے سرسیّد کی مخالفتوں کا منبع ان دونوں اشخاص کی تحریروں کو قرار دیا ہے۔ مذہبی مخالفت کے علاوہ یہ لوگ ''علی گڑھ کالج'' کے قیام اور اس کے تعلیمی نظام کے اصل مخالف تھے۔ مولوی امداد العلی لکھتے ہیں:

> ''بعض اہلیانِ ہند نے واسطے دھوکا دینے، حکامِ وقت کے، اپنا طریقۂ مذہبی اور لباس ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا، اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکام وقت، جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے، اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور ان کے محکومین ہم کو حکام کا ہم سر مانند صاحب

لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ ان کے خبیث طنیت کا کہ مکر و دغا ہی یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی دغا باز سمجھنے کے ان کو اچھا نہیں جانتے اور ان کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے۔'' ۱۰

سرسیّد مخالف کی رجعت پسند روش کے ساتھ بیسویں صدی کے بڑے ناقدین محمد حسن عسکری، سلیم احمد، شمیم احمد کے نام بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت رجعت پسندوں سے مختلف ہے۔ ان کے ذاتی نظریات کا تصادم انھیں سرسیّد کی مخالفت پر اُکساتا ہے۔ محمد حسن عسکری ایک مضمون ''پیروی مغرب کا انجام'' میں لکھتے ہیں:

''پیروی، مغرب کے صرف ایک معنی ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم مغرب کا طرزِ احساس قبول کرلیں۔ لیکن ہم نے تھوڑی دیر کے لیے رُک کر یہ نہیں سوچا کہ ہمارا طرزِ احساس کیا تھا اور اس میں کوئی تبدیلی بھی آئی یا نہیں۔'' ۱۱

سلیم احمد نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ ''میں ہر پوچھنے والی بات عسکری سے ہی پوچھتا ہوں۔'' سرسیّد کے باب میں بھی وہ عسکری کے خیالات کی توسیع نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سرسیّد کے نظریۂ فطرت کی بنیاد ''ڈی ازم'' کو قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''دراصل یہ وہی مذہبی فیشن ہے جسے ''ڈی ازم'' کہا جاتا ہے۔ ''ڈی ازم'' کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور کائنات کا تعلق ایسا ہے جیسے گھڑی اور گھڑی ساز کا، گھڑی ساز نے گھڑی بنادی، اب گھڑی اپنے کل پُرزوں سے خود چل رہی ہے۔ گھڑی ساز کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سرسیّد کے قانونِ فطرت کا تصور بھی یہی ہے۔ خدا نے کائنات کو بنایا اور بے تعلق ہوگیا۔ اب کائنات اپنے قانون کے مطابق خدا کی مداخلت کے بغیر اپنے راستہ پر رواں دواں ہے، یہ تصور ایک زمانے میں لوگوں کو بہت اچھا لگا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ بہت جلد لوگوں کو ایسے بے تعلق خدا کی موجودگی غیر ضروری معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے خدا کا انکار کیا اور خدا کی جگہ فطرت کو خدا بنالیا۔'' ۱۲

سرسیّد کے حوالے سے شمیم احمد کی رائے بھی عسکری اور سلیم احمد کے خیالات کی تکرار محض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ وہ بھی اپنے ادبی مرشدین کی طرح سرسیّد کی فکر کو گردن زدنی تصور کرتے ہیں۔

''سرسیّد کے تمام ناقدین زحمت کر کے سرسیّد کے حامیوں اور مخالفین کی تحریروں کا باقاعدہ اور غائر مطالعہ کریں تو سینکڑوں تاویلوں، متضاد طرزِ فکر، مختلف روّیوں اور اس کے دلائل و براہین میں صرف ایک ہی سراغ ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سرسیّد کی

طرزِ فکر سے ایک صدی تک یہ حذر اس لیے ممکن ہو سکا کہ بنیادی طور پر سرسیّد نے اسلام کی ترقی کی بہت کم اور مسلمانانِ برصغیر کی ترقی کی بہت زیادہ کاوش کی۔'' [۱۳]

طفیل احمد منگلوری کی مخالفت، سرسیّد کی کانگریس مخالفت کی وجہ سے تھی۔ اسلوب احمد انصاری نے بھی سرسیّد کی مخالفت، ''نظریۂ فطرت'' پر اعتراض کے ذریعے کی ہے۔ انھوں نے سرسیّد کے ''نظریہ عقل و فطرت'' کو معتزلہ اور ''ڈی ازم'' کی توسیع قرار دیا ہے اور اقبال سے تقابل بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فطرت سے سرسیّد کی مراد سبب و نتیجے کا وہ لابدی سلسلہ یا وہ قوانین ہیں جن کے ماتحت یہ سارا نظامِ کائنات جاری و ساری اور برقرار ہے۔ لیکن سرسیّد کا طریقہ تعبیر و تفسیر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی Simplistic معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے علم کے حصول کے تین مآخذ کی نشان دہی کی ہے۔ تاریخ، فطرت اور متصوفانہ تجربہ، سرسیّد نے صرف فطرت سے کسبِ فیض کرنے پر سارا زور صرف کر دینے سے علم کے حصول کے اور سارے دروازے مقفل کر دیے ہیں۔'' [۱۴]

شدید مخالفین کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ایسا ہے جو کچھ نظریات سے اختلاف اور کچھ خدمات کو سراہتا ہے ان میں زیادہ تر مذہبی مخالفت ہے اور علمی، ادبی، اصلاحی پہلوؤں کی حمایت ملتی ہے۔ ان میں شبلی، سیّد سلیمان ندوی، محسن الملک، وقار الملک کے نام شامل ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کی ایک استثنائی مثال ہے جو سرسیّد کی مغربی تقلید کے باعث مخالفت کرتے ہیں لیکن آخر عمر میں اسے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔

سرسیّد شناسی کا تیسرا رجحان، معروضی انداز میں فکرِ سرسیّد کا مطالعہ ہے۔ جس میں وسیع النظری، روشن پہلو، برداشت اور احترام کے باوجود اختلاف کے عناصر شامل ہیں۔ معروضی نقطۂ نظر رکھنے والے ناقدین نے سرسیّد اور ان کے حالات کے تقاضوں میں تطبیق کا رشتہ تلاش کیا ہے۔ معروضی طرزِ اظہار اختیار کرنے والوں میں پروفیسر عمر الدین، عزیز احمد، فضل الرحمٰن، شیخ محمد اکرام، بشیر احمد ڈار، انتظار حسین، قاضی جاوید، ابوالکلام قاسمی، محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر کے نام شامل ہیں۔

پروفیسر عمر الدین نے سرسیّد کا سب سے اہم مسئلہ قومی ترقی کی بجائے مذہبی فکر کو قرار دیا۔ وسیع اسلامی روایت میں سرسیّد کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بشیر احمد ڈار نے سرسیّد کے مذہبی کام کی اہمیت اور اس کے برصغیر کی مذہبی فکر پر اثرات کی اہمیت کو واضح کیا ہے انھوں نے پاکستان کی نظریاتی اساس کی ضرورت کو سرسیّد کے اسلامی تصور کی اصلیت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔

فضل الرحمٰن، روایت اسلام اور اسلامی تجدّد کے درمیان گمشدہ تعلق کو تلاش کرتے ہوئے سرسیّد کو خالص روایت، تصورِ کائنات، جدید سائنس اور فلسفہ کے تصور کائنات کے درمیان اختلاط کا روشن مینارہ قرار دیتے ہیں۔ عزیز احمد، سرسیّد کو اسلامی جدیدیت کے پہلے نمائندہ کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیّد احمد خان کی جدیدیت دو وسیع اور واضح مسائل میں اُلجھی نظر آتی ہے۔ اوّل غیر واجب مذہبی عقیدہ کی باریکیوں کو عقلیت کی قید و بند میں لانا، دوسرے قانون اسلام کو مطلق آزاد کر دینا، پہلے مسئلہ میں ان نفسیاتی دباؤ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن سے وقتاً فوقتاً ایسی معذرت خواہانہ وکالت وجود میں آتی ہے۔ جس سے بہ آسانی اجتناب ممکن تھا اور بعض ایسی عقلیت پسندانہ صورتیں پیدا ہوجاتی تھیں جو روایت پرستوں کے لیے قابلِ نفرت تھیں۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا سوال ہے تو باوجود قدرے معذرتی تلچھٹ کی موجودگی کے، ان کا عمل تعمیری اور نامیاتی نوعیت کا ہے اور اس طرح اس نے موجودہ اسلام پر بالعموم اور اسلام ہند پر بالخصوص زبردست نقش ثبت کیا ہے۔'' [15]

شیخ محمد اکرام ''موجِ کوثر'' میں، سرسیّد کے علم الکلام کو زیر بحث لائے ہیں۔ انھوں نے سرسیّد کی تفسیر میں قرآن، سائنس اور معتزلہ کی پیروی میں تطبیق کا رشتہ قائم کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سرسیّد کی ضرورت واہمیت کو بھی واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان تمام اسلامی ممالک کو، جن کا واسطہ مغربی حکومتوں اور مغربی علوم سے پڑا ہے۔ جدید علم الکلام کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ ترکی اور مصر میں وہی جاری ہوا ہے جو ہندوستان میں اس سے پہلے ہوا تھا۔ آخر شکوک وشبہات ایک نہ ایک دن پیدا ہونے والے تھے اور ایک طرح یہ اچھا ہوا کہ جو منزل قوم کو آج یا کل طے کرنی تھی وہ سرسیّد ایسی ہستی کی رہنمائی میں پہلے ہی طے ہوگئی۔ اس کے علاوہ اگر سرسیّد نے جدید علم الکلام کی ضرورت کو سمجھا ہے تو فقط اس وجہ سے کہ انھیں اسلام کی صداقت کا یقینِ کامل تھا۔'' [16]

قاضی جاوید نے معروضی انداز سے برصغیر میں نئی الٰہیاتی تشکیل کی تعمیر اور متصادم قوتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں سرسیّد کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے فلسفیانہ انداز میں سرسیّد کے روشن اور تاریک پہلو اُجاگر کیے ہیں لکھتے ہیں:

''ہمارے موجودہ نقطۂ نظر سے سرسیّد احمد خان کا نمایاں ترین کارنامہ اس تشکیل پذیر مسلم بورژوا طبقے کے لیے آئیڈیالوجی فراہم کرنا ہے۔ یہ نئی آئیڈیالوجی اسلام کی ایک تعبیر سے عبارت ہے جو تغیر پذیر حالات سے ہم آہنگ اور اس طبقے کے مفادات کے مطابق تھی۔ انیسویں صدی کے مسلم بورژوا طبقے کے اس نظریہ ساز نے اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کے افکار اور خصوصاً ان کے منہاج سے خاطر خواہ مدد لی تھی۔'' ۱۷

عتیق صدیقی نے معروضیت کا انداز برتتے ہوئے سرسیّد کے نظریۂ تعلیم اور ادبی خدمات کو ان کی تحریروں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ محمد علی صدیقی، برصغیر میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے بانی کا سہرا سرسیّد کے سر باندھتے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی کے نزدیک سرسیّد کی علمی، ادبی، سماجی خدمات کا اصل محرک ان کا تصورِ تہذیب ہے اور وہ مشرق اور مغرب کی روحانی اور مادی اقدار کو سرسیّد کے تہذیبی شعور کی بنیاد سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تہذیب کا لفظ اگر اپنے اصطلاحی معنوں میں تصورِ اقدار اور اس کی موضوعی مادّی، تمام جہات کا اعادہ کرتا ہے تو سرسیّد کا تہذیبی شعور صحیح معنوں میں ایک ایسا ہمہ گیر تہذیبی شعور تھا جس میں روحانیت کے ساتھ مادّیت اور دنیا کے ساتھ دین کا توازن برقرار رکھنے کا رجحان نمایاں ہے۔ سرسیّد کے تہذیبی روّیے کو ان کے پورے دائرۂ کار کے تناظر میں رکھ کر نہ دیکھنے کا نتیجہ اب تک سہل پسندانہ فیصلوں اور فتوؤں کی شکل میں سامنے آیا ہے۔'' ۱۸

موجودہ دور میں سرسیّد کی بابت یہ نیا سوال سر اُٹھا رہا ہے کہ کیا آج سرسیّد کی ضرورت ہے؟ مختلف ناقدین نے اس کا مختلف تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے زیادہ معتبر دکھائی دیتی ہے جو کہ معروضیت کا جامہ پہنے ہوئے ہے، لکھتے ہیں:

''کروڑوں تہذیبی، تمدنی تغیرات اور متغیر اقدار کے باوجود بھی سرسیّد احمد خان جو زندہ رہے تو اسی باعث کہ انھوں نے طرزِ کہن پر اُڑنے کی بجائے عقل کی راہ نمائی میں استدلال کی قوت کے ساتھ آئینِ نو کا پرچار کیا اور یوں ہر عہد کے لیے مرشد اور معلم کا درجہ حاصل کیا۔ بہ ظاہر سرسیّد حال کے مصلح نظر آئے مگر ان کے لیے حال محض لمحہ موجود ہونے کے برعکس تسبیح روز و شب کے دانے دانے کے مترادف تھا۔ یوں حال کے لمحات، مستقبل کے تارِ حریر دور رنگ میں پروئے منور موتی ثابت ہوتے ہیں۔'' ۱۹

سرسیّد شناسی کی روایت یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ یہ روز افزوں جاری ہے اور نئے علمی تناظر میں اس کا تجزیہ جاری رہے گا۔ کیوں کہ سرسیّد، ماضی، حال اور مستقبل کے نقیب ہیں اور برصغیر کی علمی، ادبی، مذہبی اور فکری آزادی کا نقطۂ آغاز بھی کوئی صاحبِ ادراک اپنی تاریخی اور مستقبل بیں شخصیات سے بے بہرہ نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ حالات و واقعات کے جدلیاتی مظاہر کے پیشِ نظر، سرسیّد کے فکری سمندر میں غوطہ زن ہوکر شناور کا جویا رہے گا اور سرسیّد شناسی کی روایت میں نئے ابواب اور مدارج کا اضافہ کرتا رہے گا۔ حالؔی نے جو بات آج سے ایک صدی قبل کی تھی وہ آج بھی زیادہ صداقت کی حامل نظر آتی ہے۔

> ''جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا۔ اس قدر سرسیّد کے کاموں کی زیادہ قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی۔ متعدد لوگ ان کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اُٹھائیں گے اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔'' [۲۰]

آج برصغیر میں مسلمان جس فکری بے چارگی اور پسماندگی کا حامل ہے ایسے لمحے میں فکرِ سرسیّد کی نئی توضیح اور اس میں اضافے کی ضرورت سرسیّد کے اپنے زمانے سے زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ یوں سرسیّد شناسی کی روایت ہمارے زمانے میں اس لیے بھی اہمیت اختیار کرلیتی ہے کہ ہمارے زمانے کے فکری انتشار میں فکر کی یہ روشن روایت ہمیں اپنے وجود کے مثبت زاویوں سے آشنائی عطا کرتی اور اجتہاد کی ضرورت پر زیادہ سے زیادہ زور دیتی نظر آتی ہے۔ آج جب مغرب میں تہذیبوں کے ٹکراؤ کے مصنوعی سوالات اُٹھائے جا رہے ہیں، سرسیّد کی فکر ہمیں اپنی تہذیب کا زیادہ سے زیادہ شعور عطا کر رہی ہے۔

حواشی:

۱۔ ''حیاتِ جاوید''، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۔

۲۔ ''تہذیب ادب میں سرسیّد کا کارنامہ''، مضمون مشمولہ، انتخاب آل احمد سرور، مرتبہ: فقیر احمد فیصل، لاہور اکیڈمی، لاہور، سن ندارد، ص ۶۲۔۶۳۔

۳۔ ''سرسیّد مرحوم اور اُردو لٹریچر''، مضمون مشمولہ نگار پاکستان، سرسیّد نمبر، حصہ اوّل، ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۔

۴۔ ''علی گڑھ کی علمی خدمات''، انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰۔

۵۔ ''سرسیّد احمد خاں، حالات و افکار''، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۷۶۔

۶۔ ''سرسیّد بحیثیت مؤرخ''، تہذیب کراچی، سرسیّد نمبر، مارچ ۱۹۹۸ء۔
۷۔ مضمون مشمولہ ''سپوتنک''، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء۔
۸۔ مضمون مشمولہ ''لمحے کی داستان''، تہذیب، کراچی، سرسیّد نمبر، مارچ ۱۹۹۸ء۔
۹۔ دارالاشاعت ''تفسیرِ حقانی''، دہلی، ۱۹۳۸ء، جلد دوم، ص ۱۱۲۔
۱۰۔ بحوالہ ''حیاتِ جاوید''، از الطاف حسین حالی، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۵۶۹۔۵۷۰۔
۱۱۔ مضمون مشمولہ ''ستارہ یا بادبان''، سن ندارد، ص ۱۰۳۔
۱۲۔ ''اسلامی تہذیب، جدید تہذیب اور ادب''، روایت نمبر ۱، لاہور، سن ندارد، ص ۳۶۳۔
۱۳۔ ''۲+۲=۵''، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، ص ۲۶۔
۱۴۔ ''سرسیّد کا نظریہ عمل و فطرت''، مضمون مشمولہ مسلک، ایجوکیشن کالج ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۹۶۔
۱۵۔ ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، مترجم: ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۷ء، ص ۸۵۔
۱۶۔ ''موجِ کوثر''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵۔
۱۷۔ ''سرسیّد سے اقبال تک''، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۲۹۔
۱۸۔ ''سرسیّد کا تہذیبی شعور''، مضمون مشمولہ مسلک، ایجوکیشن کالج، ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۷۔
۱۹۔ ''کیا آج سرسیّد کی ضرورت ہے؟''، مضمون مشمولہ، چہارسُو، راولپنڈی، مارچ، اپریل ۲۰۰۰ء۔
۲۰۔ ''حیاتِ جاوید''، ص ۲۱۔

کتابیات

۱۔ احمد خاں، سیّد، سر: مترجم افضل حسین قاضی، ''فکرِ اسلام کی تعبیرِ نو''، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۸ء۔
۲۔ اکرام شیخ: ''موجِ کوثر''، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۳ء۔
۳۔ جمیل یوسف: ''سرسیّد احمد خاں، فن اور شخصیت''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء۔
۴۔ حالی، الطاف حسین: ''حیاتِ جاوید''، لاہور، نیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء۔
۵۔ حسن عسکری: ''ستارہ یا بادبان''، لاہور، مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳ء۔
۶۔ حقانی، عبدالحق: ''تفسیرِ حقانی''، دہلی، دارالاشاعت تفسیر حقانی، ۱۹۳۸ء۔
۷۔ شمیم احمد: ''۲+۲=۵''، کوئٹہ، قلات پبلشرز، ۱۹۷۷ء۔
۸۔ عزیز احمد، (مترجم): ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، طبع دوم، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۷ء۔
۹۔ عمرالدین، پروفیسر: ''سرسیّد احمد خان کا نیا مذہبی طرزِ فکر''، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۵ء۔
۱۰۔ قاضی جاوید: ''سرسیّد سے اقبال تک''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۰ء۔

رسائل

۱۔ ماہ نامہ: ''افکار''، کراچی، جنوری، ۱۹۹۲ء۔

۲۔ ماہ نامہ: ''تہذیب، سرسید نمبر''، کراچی، مارچ، ۱۹۹۸ء۔

۳۔ سہ ماہی: ''روشنائی''، کراچی، شمارہ، ۲۰ جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء۔

۴۔ ماہ نامہ: ''صریر''، کراچی، ستمبر ۲۰۰۳ء۔

۵۔ ماہ نامہ: ''نگار، سرسید نمبر''، حصہ اوّل، کراچی، نومبر، دسمبر ۱۹۷۰ء۔

O < ------ > O